سُنّت

صدر اسلام میں اس کا تصوّر اور ارتقاء

ڈاکٹر احمد حسن — ترجمہ: شاہ محی الحق فاروقی

آئیے اب ہم ابتدائی دور کے فقہاء یعنی امام اوزاعی، مالک، ابویوسف اور امام محمد بن الحسن کی تصانیف میں لفظ سنت کے استعمال کو دیکھیں، اور اس بارے میں ان کی رائے کا جائزہ لیں۔

ان میں سب سے قدیم شام کے امام اوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ) ہیں جو بار بار مسلمانوں کے اس تعامل کا حوالہ دیتے ہیں جو رسول اکرمؐ کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ ابوحنیفہ سے اپنے اختلاف کے دوران وہ بیشتر مسائل میں پہلا انحصار حضور اکرمؐ کے عمل پر کرتے ہیں پھر اپنے دلائل کو مستحکم بنانے کے لئے وہ صحابہ اور ابتدائی عہد کے مسلمانوں کے عمل کا حوالہ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تائیدی شہادت کے طور پر وہ سیاسی حکمرانوں (ائمہ یا ولاۃ المسلمین) بلکہ ولید بن یزید (۱۲۶ھ) کے قتل کے وقت تک[۴۱] بنو اُمیہ کے عمل کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ ہم نے پہلے بتایا ہے کہ کس طرح ان کے "مضت السنۃ" کی اصطلاح کے استعمال پر ابویوسف ان پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ امام اوزاعی کے اس رویہ پر بھی اعتراض کرتے ہیں کہ وہ بار بار مسلمانوں اور سیاسی حکمرانوں کے عمل سے بھی یہ کہہ کر اختلاف کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ عمل شام کے ان فقہاء کی رائے ہو جو فقہ کے بعض چھوٹے چھوٹے مسائل سے بھی واقف نہیں ہیں۔[۴۲]

امام اوزاعی کے ساتھ ابویوسف کے اختلافات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حالات میں سنت میں اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ ایک فقیہہ رسول اکرمؐ کی زندگی کے کسی ایک واقعہ کو نئے پیش آنے حالات پر چسپاں کرتا ہے تو دوسرا اس سے بالکل مختلف دلائل پیش کرتا ہے مثلاً ابوحنیفہ کے خیال کے مطابق اگر ایک غیر مسلم اسلام قبول کر کے اپنا گھر بار اور جائداد چھوڑ دیتا ہے اور مسلمان اس غیر مسلم علاقہ کو فتح کر لیں تو اس نومسلم کی جائداد بھی مالِ غنیمت شمار ہو گی لیکن امام اوزاعی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ فتحِ مکہ

کی مثال دیتے ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی جائداد پر قبضہ نہیں کیا اور انھیں قیدی نہیں بنایا۔ مزید برآں وہ کہتے ہیں کہ "جو شخص اتباع کا سب سے زیادہ مستحق ہے اور جس کی سنت سے وابستہ رہنا ضروری ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔" وہ قاضی شریح کا بھی حوالہ دیتے ہیں کہ اُنھوں نے کہا: "سنت تمہارے اس قیاس پر فوقیت رکھتی ہے لہذا اس کی اتباع کرو اور بدعت مت پیدا کرو۔ جب تک تم روایت پر عمل کرو گے گمراہ نہیں ہو گے" لیکن اپنے اُستاد کی رائے کی مدافعت کرتے ہوئے ابو یوسف کہتے ہیں کہ فتح مکہ ایک استثنائی معاملہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند نہیں ہیں اور نہ غیر عرب اور اہلِ کتاب کا معاملہ عربوں کی مانند ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ان کفار عرب پر جو اہلِ کتاب نہیں جزیہ نہیں لگایا جائے گا بلکہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ان کے خیال میں جزیہ صرف غیر عرب کافروں پر لگایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنت یہی رہی ہے کہ مالِ غنیمت فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور امام کو کوئی حق نہیں کہ وہ انھیں اس سے محروم کرے لیکن (ابو یوسف کہتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر ایسا نہیں کیا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اگر فتحِ مکہ کے موقع پر آپؐ کے عمل کو مقررشدہ عمل (الامر) مان لیا جائے تو پھر کسی کو اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کسی شخص کو گرفتار کرے اور جنگ میں مالِ غنیمت حاصل کرے۔ اپنی رائے کی تائید میں وہ غزوہ ہوازن کو پیش کرتے ہیں، جس میں ایسے ہی استثنائی قانون پر عمل کیا گیا۔ وہ کہتے ہیں اس جنگ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہوازن کو ان کے قیدی واپس کر دیئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ اس معاملہ کو بھی سنت کہتے ہیں جسے وہ استثنائی قرار دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا معاملہ خود ان کے لیے بالکل صحیح تھا لیکن دوسرے لوگ اسے نظیر نہیں بنا سکتے۔ [۴۳]

مذکورہ بالا مثال سے ہم چند نتائج اخذ کر سکتے ہیں: اوّل یہ کہ امام اوزاعی کی رائے کے مطابق دوسرے لوگ بھی کوئی سنت قائم کر سکتے ہیں مگر اس پر سنتِ نبوی غالب اور مقدم رہے گی۔ دوسری بات یہ کہ ایسے مسائل میں جہاں واضح ھدایات موجود نہ ہوں تو انہیں حالات سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی واقعہ کو منطبق کر کے رائے کی بنیاد پر بھی سنت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ دلائل کی بنیاد پر سنت کی تعیین میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ کسی قانون عمومی کے استثناء کو بھی سنت کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ابو یوسف بھی استثناء کو سنت کہتے ہیں لیکن وہ اسے قابلِ تقلید مسلمہ سنت نہیں سمجھتے۔

سنت کے بارے میں ابو یوسف اور اوزاعی کے نظریات نتائج کے اعتبار سے بہت زیادہ مختلف نہیں

ہیں اس کے باوجود ان میں کچھ ایسے نکات نظر آتے ہیں جو ان دونوں کو اپنے طرزِ فکر میں ایک دوسرے سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ امام اوزاعی عام طور سے نبی اکرمؐ کی روایتوں کو سلسلہ اسناد کے ساتھ رسمی طریقہ سے پیش نہیں کرتے۔ وہ نبی اکرمؐ کی زندگی کے کسی واقعہ کا حوالہ کسی رسمی طریقہ روایت کے بغیر دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ابو یوسف نبی اکرمؐ کی روایتوں کو رسمی انداز میں بیان کرتے ہیں اگرچہ وہ بھی اتنے مکمل اسناد کے ساتھ پیش نہیں کرتے، جیسے امام شافعی وغیرہ کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حدیث کے راوی ثقہ ہوں۔ لیکن اس قسم کی کوئی بات امام اوزاعی کے یہاں ہمیں نہیں ملتی۔ اوزاعی کے مقابلہ میں ابو یوسف کے یہاں حدیث پر زیادہ زور ہے۔ بعض مسائل میں امام اوزاعی سنتِ نبوی کا حوالہ نہیں دیتے بلکہ تواتر پر اپنی رائے کو بنیاد بناتے ہیں لیکن ابو یوسف میں یہ بات بہت کم ہے۔ امام اوزاعی بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مستثنیٰ نظیروں کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں لیکن ابو یوسف ہمیشہ نبی اکرمؐ کے عام طریقہ کو بنیاد بناتے ہیں۔ امام اوزاعی کے دلائل بہر حال اہم ہیں کیونکہ اس سے ہمیں ایک قانون ملتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت کی تقلید کی جانی چاہیئے خواہ وہ عام ہو یا استثنائی (جب تک قرآن مجید سے یا خود آپؐ کی حدیث سے صراحتہ یہ نہ معلوم ہو کہ فلاں فلاں سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھی۔ یہ وہ دلیل ہے جسے امام اوزاعی کی تائید میں امام شافعی پیش کرتے ہیں)۔ [۴۴]

موطا میں امام مالک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فقہی مسائل سے متعلق مختلف موضوعات کے ذیل میں اوّلاً مرفوع حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد صحابہ کے آثار لاتے ہیں، پھر فقہائے مدینہ کا عمل یا رائے پیش کرتے ہیں اور عام طور پر فقہاء سبعہ مدینہ میں سے کسی ایک کی رائے نقل کرتے ہیں اور کہیں کہیں خلفائے بنی اُمیہ مثلاً مروان بن الحکم، عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز کے فیصلوں کو بطورِ نظیر پیش کرتے ہیں اس کے بعد وہ خود اپنے مکتبِ فکر یعنی اہلِ مدینہ کی آراء کو چند مخصوص اصطلاحات میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اصطلاحات یہ ہیں:۔ مضت السنة (ماضی میں سنت اسی طرح تھی) السنة عندنا (ہمارے نزدیک سنت یہ ہے) السنة التی لا اختلاف فیہ عندنا (وہ سنت جس میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں) الامر عندنا (ہمارا عمل) الامر المجتمع علیہ عندنا (ہمارا عام متفقہ عمل یہ ہے) اور الامر الذی لا اختلاف فیہ عندنا (ہمارا عمل جس میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں)۔ یہ اصطلاحات مؤطا میں بار بار ادل بدل کر اہلِ مدینہ کے متفقہ عمل کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ امام مالک بعض معاملات

میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[۴۵] صحابہ اور تابعین کی رائے کے مقابلہ میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب روایت کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک مدینہ کا متفقہ اور مقررہ عمل ہی مثالی عمل تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل نے فقہاء عراق[۴۶] اور امام شافعی کو امام مالک پر حدیث سے عدم توجہی کا الزام لگانے کا موقع فراہم کر دیا۔

اہلِ مدینہ کے مقابلہ میں فقہاء عراق اور امام شافعی کے حدیث پر زور دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تعامل مدینہ براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا، اس لئے وہ خود اپنی جگہ ماخذ قانون اور سند تھا۔ اور اس کے لئے حدیث کی تائید کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن کوفہ اور بصرہ کو یہ امتیاز حاصل نہ تھا۔ دراصل اہلِ عراق حدیث اور رائے کو ملا کر خود اپنی ایک روایت قائم کر رہے تھے۔ امام شافعی نے علاقائی روایت کے برخلاف ایسی روایت قائم کرنے کی کوشش کی جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل پر ہو تاکہ وہ عالم گیر بن سکے[۴۷]۔ اس سے پروفیسر شخت نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "یہ اہلِ مدینہ نہیں بلکہ اہلِ عراق تھے جنہیں امام شافعی سے پہلے سنتِ نبوی کے تصوّر سے آگاہی ہوئی[۴۸]"
بہرحال ہم یہ بات پہلے بتا چکے ہیں کہ سنتِ نبوی کا تصور نہ اہلِ عراق کے لئے نیا تھا نہ اہلِ مدینہ کے لئے، بلکہ ابتدائے اسلام ہی سے یہ تصور موجود تھا۔

امام مالک کے یہاں سنت صرف نبی اکرمؐ کی روایتوں پر منحصر نہیں ہے اور نہ یہ ہمیشہ صحابہ یا تابعین کی روایتوں پر منحصر ہوتی ہے کیونکہ بعض اوقات امام مالک ان کے مرویہ افعال کو بھی بحیثیت قائم شدہ سنت کے مسترد کر دیتے ہیں[۴۹]۔ ان کے خیال میں سنت کا انحصار کبھی نبی اکرمؐ کی روایتوں پر ہوتا ہے کبھی صحابہ اور تابعین کے افعال پر اور کبھی اس تعامل پر جو مدینہ میں آپ کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا[۵۰]۔ مدینہ کے مسلمانوں کا متفقہ عمل اصل سنت معلوم کرنے کا پیمانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کہ امام مالک سنت کی اصطلاح کو مدینہ والوں کے متفقہ عمل کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں ان کے اپنے اقوال سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ سنت اور دوسری اصطلاحوں مثلاً "الامر المجتمع علیہ عندنا" کو متبادل اصطلاحوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں، دوسری بات یہ کہ وہ خود بھی اکثر معاملات میں تعامل کا حوالہ دیتے ہیں[۵۱]۔ تیسری بات یہ کہ وہ کہیں کہیں مدینہ کے علماء کے اجماع کا حوالہ دیتے ہیں[۵۲]۔ چوتھی بات یہ کہ مؤطا میں بعض ابواب کا عنوان سنت ہے اور بعض کا عمل، اور دونوں میں تعامل مدینہ

کو ہی بتلایا گیا ہے[53]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سنت اور عمل کی اصطلاحیں مترادف تھیں۔ امام شافعی اپنے ایک مدنی مناظر سے کہتے ہیں "تم سنت کو دُہری بنیاد پر قائم کرتے ہو یعنی ایک تو وہ باتیں جو صحابہ کی رائے کے مطابق ہوں اور دوسری وہ چیزیں جن میں لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو[54]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کا اشارہ اہلِ مدینہ کے اس اجماع کی طرف تھا جسے مدینہ والے سنت کہتے تھے۔

امام مالک اور اہلِ مدینہ نے تعامل کی پیروی کیوں کی، اس کا سبب یہ ہے کہ صحابہ نے ہر قسم کے حالات میں نبی اکرمؐ کے عمل کو دیکھا تھا اور خود ان کے متعلق بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی عمل کی اتباع کرتے ہیں اسی طرح بعد کی نسل نے ان صحابہ کو بھی اسی طرح عمل کرتے ہوئے دیکھا لہٰذا تیسری نسل تک نبی اکرمؐ کی سنت کے متعلق یہ طے ہوگیا کہ وہ معاشرہ میں ظاہر و باہر ہوگئی ہے۔ اب اس میں کوئی راز نہیں ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا سنتِ نبویؐ زیادہ سے زیادہ نمایاں اور عام آدمی کے لئے آشکارا ہوتی گئی۔ اگر کسی صحابی کو یہ بات پہلے نہیں معلوم تھی تو بعد میں معلوم ہوگئی۔ مدینہ میں تقریباً تیس[30] ہزار صحابہ تھے ان کا مسلّمہ، معروف اور مروجہ عمل آحاد روایتوں سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ مزید برآں اشاعتِ حدیث کی بنیاد ایک، دو یا زیادہ سے زیادہ چھ افراد پر تھی لیکن تعامل کا علم ہزاروں افراد کو تھا لہٰذا اصل سنت معلوم کرنے کے لئے ان کے نزدیک سلسلہ روایت سے زیادہ معتبر سلسلۂ عمل تھا۔ یہ ان دلائل کا خلاصہ ہے جو امام شافعی کے اعتراضات کے جواب میں ایک مدنی مناظر نے پیش کئے تھے[55]۔ اس قسم کے دلائل کو امام شافعی نے رد کر دیا۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ 'سنتِ نبوی' کے تصور میں امام مالک کے دلائل کس حد تک واضح ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا امام مالک تعاملِ مدینہ کو صرف سنت سمجھتے تھے یا اس کو سنتِ نبوئی کا درجہ دیتے تھے، لیعنی اس تعامل کو معیار سمجھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کا عمل پیشِ نظر تھا یا نہیں؟۔ انہوں نے ایک باب کا عنوان "سنۃ الاعتکاف" رکھا ہے۔ اس عنوان کے تحت وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کسی عالم کو اعتکاف میں کوئی شرط قائم کرتے نہیں سنا۔ مزید برآں وہ کہتے ہیں کہ اعتکاف دوسرے اعمال مثلاً نماز، روزہ اور حج کی طرح ایک عمل ہے جو شخص ان اعمال کو ادا کرتا ہے اُسے چاہیئے کہ ان پر عمل کرنے میں اس تعامل کی پیروی کرے جو شروع سے چلا آرہا ہے۔ اسے عہد گزشتہ کے مسلمانوں کے عمل کے خلاف کوئی

نئی چیز قائم نہیں کرنی چاہیئے، نہ اسے کوئی نئی شرط عائد کرنی چاہیئے اور نہ کوئی نئی بات قائم کرنی چاہیئے۔ بحث کے خاتمہ پر وہ کہتے ہیں کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف پر عمل کیا اور مسلمانوں نے اعتکاف کی سنت کو قائم کیا"[56]۔ اس مثال میں امام مالک واضح طور پر نبی اکرمؐ کی سنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ بہرحال بہت سے مقامات پر وہ اس تعامل کا ذکر بھی کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس کا زیادہ واضح اظہار چند مسائل میں ان کے اس سرسری تبصرہ سے بھی ہوتا ہے کہ "نبی اکرمؐ کے عہد سے یہی طریقہ چلا آرہا ہے"[57]۔ اس کے علاوہ بہت سے معاملات میں اپنے دلائل کی بنیاد وہ نبی اکرمؐ کے اس اُسوہ پر رکھتے ہیں جو حدیث کی شکل میں ان تک پہنچا۔ مثال کے طور پر ان کا نظریہ یہ ہے کہ سر کی ایسی چوٹ کا جو الموضحہ (ہڈی کو ظاہر کرنے والی) نہ ہو کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ وہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے عمرو بن حزمؓ کے نام اپنے مکتوب میں ان ضربات کے لئے جو الموضحہ کی حد تک پہنچ جائے پانچ اونٹ مقرر کئے ہیں۔ امام مالک کے شاگرد ابنِ قاسم (متوفی ۱۹۱ھ) امام مالک کی حدیث سے استدلال کے مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ امام مالک عورت کے نکاح کے جواز کے لئے ولی کی اجازت کی شرط لگاتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ حضرت عمرؓ کے ایک اثر اور مدینہ کے دو فقہاء یعنی قاسم بن محمدؒ اور سالم بن عبداللہ کے طرزِ عمل پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھتے ہیں گویا امام مالک آپ کی اس حدیث کی پیروی نہیں کرتے جس کے مطابق عورت کے نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ اپنے اُستاد کی تائید کرتے ہوئے ابن قاسم کہتے ہیں کہ اگر مخالف حدیث تعامل کے موافق ہوتی تو وہ اُسے تسلیم کر لیتے لیکن امر واقعہ یہ نہیں ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ اور ان کے صحابہ کی جانب بہت سی حدیثیں منسوب کی جاتی ہیں لیکن وہ تعامل سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ صحابہ اور عام لوگوں نے انھیں حدیثوں کو تسلیم کیا جو تعامل کے مطابق تھیں لہٰذا وہ روایتیں رد و قبول کے بغیر باقی رہ گئیں۔ تابعین کو یہ حدیثیں صحابہ سے ملیں اور اسی طرح بعد کی نسلوں کو ملیں اور جو کچھ ان تک پہنچا اُنھوں نے اسے ناقابلِ اعتبار یا مسترد قرار نہیں دیا۔ وہ اپنی بحث کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ اندریں حالات جو چیز تعامل کے موافق نہ ہو اُسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اگرچہ اصولی طور پر اسے ناقابلِ اعتبار قرار نہیں دیا جاتا اور جو بات تعامل کے مطابق ہو اس کی اتباع اور تصدیق کی جاتی ہے[59]۔ اس سے یہ استنباط کرنا چاہیئے کہ جیسا ہم نے پہلے بیان کیا نبی اکرمؐ سے تعامل اور روایت دونوں ساتھ ساتھ لوگوں تک پہنچے۔ امام مالک نے ان روایتوں کا اتباع کیا جن پر عام طریقہ سے عمل ہوتا تھا اگرچہ اُنھوں نے

دوسری حدیثوں کو مسترد نہیں کیا۔ کتے کے چاٹے ہوئے برتن کو پاک کرنے کے بارے میں وہ کہتے ہیں "حدیث تو موجود ہے لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی حقیقت کیا ہے"[60] لہٰذا امام مالک اور اہلِ مدینہ کے بارے میں یہ عمومی نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایتوں پر صحابہ کی روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں[61]۔ ان لوگوں کے سامنے ترجیح کا مسئلہ تھا ہی نہیں بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ کس ذریعہ سے مثالی سنت تک رسائی ہو، تعامل سے یا روایت سے؟۔

امام ابو یوسف سے اس عہد کا آغاز ہوتا ہے جب حدیث کو عام طور سے سنت کی تائید کے لئے استعمال کیا جانے لگا اگرچہ اس وقت بھی دونوں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ ابو یوسف، نبی اکرمؐ کے عمل اور طریقہ کی اس شکل کو جو بعد کے مسلمانوں کے عمل سے ظاہر ہو سنت قرار دیتے ہیں۔ ان کے دلائل میں سنت اور حدیث متوازی ہیں وہ کسی ایسی احاد حدیث کو قبول کرنے کے سخت خلاف تھے جو معروف سنت یا فقہاء کے درمیان مشہور روایتوں کے خلاف ہو وہ امام اوزاعی کی "مضت السنۃ" جیسی مبہم اصطلاح کو تسلیم نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اس کا ماخذ معلوم ہو۔ ان کے خیال کے مطابق سنت کے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہاء اور علماء کو معلوم ہو۔ حسبِ ذیل عبارتوں میں ہم مثالوں کے ذریعہ ان نکتوں کی وضاحت کریں گے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے ابو یوسف سے پوچھا کہ کفار سے جنگ شروع کرنے سے پہلے انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟ خلیفہ نے یہ بھی کہا کہ کفار کو دعوتِ اسلام دینے، ان سے جنگ کرنے اور ان کے بچوں کو گرفتار کرنے کے سلسلہ میں سنت بیان کریں۔ ان سوالوں کے جواب میں ابو یوسف نے ان ہدایتوں کا ذکر کیا جو نبی اکرمؐ اپنے صحابہ کو کفار کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجتے وقت دیا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے صحابہ اور بالخصوص ابو بکرؓ اور عمرؓ کے عمل سے بھی خلیفہ ہارون الرشید کو آگاہ کیا[62]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سنت صرف مسلمانوں کے عمل کا نام نہیں تھا۔ بلکہ وہ سنت کو ابتدائی طور پر نبی اکرمؐ کے اس اسوہ سے اخذ کرتے ہیں جو صدرِ اسلام کے مسلمانوں میں مشہور اور مروج تھا۔

ان (ابو یوسف) کی تصانیف میں عام طور سے سنت اور حدیث کی اصطلاحیں ساتھ ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ سنت کی تائید حدیث سے پیش کرنے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں کیونکہ وہ زمانہ اب قریب آگیا تھا جب تعامل اُمت کو بلا سند کے حجت تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، وہ امام اوزاعی کی اس رائے کی تردید کرتے ہیں کہ ان عورتوں اور ذمیوں کو ایک مقررہ حصہ دیا جائے جو مسلمانوں کی طرف سے

جنگ کریں۔ ابو حنیفہؒ کی مدافعت اور ان کی رائے کی تائید میں وہ نبی اکرمؐ کی مختلف احادیث کو پیش کرتے ہیں۔ بحث کا خاتمہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "اس مسئلہ میں احادیث بے شمار ہیں اور سنت عام طور سے مشہور ہے:" یہ بتانا ضروری ہے کہ خود امام اوزاعی بھی نبی اکرمؐ کے اُسوہ اور مسلمانوں اور ان کے سیاسی حکمرانوں کے عمل پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن ابو یوسف ان کی رائے کو اس لئے مسترد کرتے ہیں کہ اس کا علم فقہاء کو نہیں اور یہ ان بہت سی حدیثوں کے خلاف ہے جن کا علم ان (ابو یوسف) کو تھا۔[۶۳] اس مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو یوسف زیادہ تر ان حدیثوں پر اعتماد کرتے ہیں جو عام طور پر مشہور ہوں۔ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت یا تعامل کا محض حوالہ ہی ان کے لئے کافی نہیں ہے۔

ایک مجاہد کے دو گھوڑوں کے درمیان مالِ غنیمت کا حصہ مقرر کرنے کے مسئلہ پر ابو یوسف محض حدیث کی بنیاد پر امام اوزاعی سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ امام اوزاعی کی پیش کردہ حدیث کو شاذ قرار دیتے ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے۔[۶۴] یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس معاملہ میں وہ کسی عمل کا حوالہ نہیں دیتے۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ ان کے خیال کے مطابق شاذ حدیث وہ ہے جو مروجہ عمل اور اس موضوع پر مشہور اور کثیر روایتوں کے خلاف ہو۔ اس مثال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابو یوسف عمل کی بجائے حدیث کی جانب رجوع کررہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابو یوسف اکثر و بیشتر حدیث کا حوالہ دیتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے قبول کرنے کے معاملہ میں وہ بہت سخت ہیں۔ انہوں نے اس کی صحت کو پرکھنے کے لئے کچھ معیار مقرر کرلئے تھے وہ کسی ایسی حدیث کو قبول نہیں کرتے جو قرآن مجید یا کسی معروف سنت کے خلاف ہو۔ وہ قرآن مجید اور معروف سنت (السنۃ المعروفہ) کو معیار بنانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کسی نئے معاملہ کو صرف انہیں پیمانوں پر جانچنا چاہیئے۔[۶۵] وہ سمجھتے تھے کہ حدیث کی اشاعت بڑھتی جارہی تھی اور شاذ احادیث سامنے آرہی تھیں لہٰذا وہ احاد روایتوں کے خلاف متنبہ کرتے ہوئے ان حدیثوں کا اتباع کرنے پر زور دیتے ہیں جن پر اُمت کا تعامل ہو، اور جو فقہاء میں معروف ہوں اور قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔[۶۶] اس سلسلہ میں وہ ایک حدیث کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس سے امام شافعی نے بھی استدلال کیا ہے۔[۶۷]

مفت السنۃ کی مبہم اصطلاح کے کثیر استعمال کی وجہ سے ابو یوسف امام اوزاعی اور فقہائے حجاز سے ناراض ہیں لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسی کو وہ امام زہری سے قبول کرلیتے ہیں جس کی وجہ ہمارے

خیال میں یہ ہے کہ ان کے ہاں واضح طور پر نبی اکرمؐ اور صحابہ کے حوالے ملتے ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ " یہ نبی اکرمؐ اور ان کے بعد اوّل دو خلفاء کی سنت رہی ہے کہ حدود کے معاملہ میں عورت کی گواہی معتبر نہیں"[68]، وہ خود بھی اپنے استدلال کے دوران وقتاً فوقتاً اسی قسم کی اصطلاحیں استعمال کرجاتے ہیں[69]۔ ان کے خیال میں سنت کے ماخذ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے حسبِ ذیل الفاظ ان کے نظریہ کو ظاہر کرتے ہیں" جائز اور ناجائز کے مسئلہ میں فیصلہ صرف لوگوں کے عمل پر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ لوگ بہت سی ایسی باتیں کرتے رہے ہیں جو ناجائز ہیں اور نہیں کرنی چاہئیں۔ فیصلہ کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اور سلف میں سے صحابہ وفقہاء کو بنانا چاہیئے[70]۔" لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ شام کے علماء کو اس بارے میں معتبر نہیں سمجھتے جن کا حوالہ امام اوزاعی اپنے مباحث میں دیتے ہیں۔ وہ امام اوزاعی سے پوچھتے ہیں کہ وہ علماء و حکمران جن کے عمل کو وہ سند سمجھتے ہیں کون ہیں تاکہ وہ یہ معلوم کرسکیں کہ کیا وہ لوگ معتبر اور مستند ہیں[71]۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابتدائی دَور کے مکاتبِ فقہ دوسرے علاقہ کے فقہاء کے مقابلہ میں اپنے علاقہ کے فقہاء پر زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ اسی وجہ سے علاقائی اجماع کے تصور نے جنم لیا، اور سنت میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔

سنت کے معاملہ میں امام محمدؒ امام ابو یوسف سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ دلائل کے سلسلہ میں ان کا معمول یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر پہلے وہ سنت بیان کرتے ہیں پھر نبی اکرمؐ کی احادیث اور صحابہ کے عمل سے اس کی تائید پیش کرتے ہیں آخر میں وہ ابو حنیفہ اور عراق کے علماء کی عام رائے بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ مجوسیوں پر جزیہ لگایا جائے۔ ان کی عورتوں سے شادی نہ کی جائے اور ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔ پھر وہ کہتے ہیں" ہمیں اسی طرح نبی اکرمؐ سے پہنچا ہے۔"[72]

ابو یوسف کی طرح وہ بھی اپنے استدلال کی بنیاد معروف احادیث پر رکھتے ہیں اور بعض اوقات "السنة المعروفه" کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں[73]۔ لیکن بار بار ان کا یہ کہنا کہ " یہ ابو حنیفہ اور ہمارے فقہاء کی عام رائے ہے" ان کے استدلال میں مقامی رنگ کی جھلک پیش کرتا ہے۔ وہ امام مالک اور اہلِ مدینہ پر شدید اعتراض کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرمؐ کی ان احادیث کو بھی نظر انداز کردیتے ہیں جن کو وہ خود ہی بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ امام شافعی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے سے گزرنے میں کوئی حرج نہیں۔ امام محمد مدینہ والوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ ان روایتوں کو بیان کرتے ہیں جن پر وہ خود عمل نہیں

کرتے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اگر میں ان لوگوں پر ان کی اپنی بیان کردہ روایتوں کی بنیاد پر تنقید کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ بحث کا خاتمہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یہ لوگ احادیث کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور جس چیز کی چاہتے ہیں اتباع کرتے ہیں حالاں کہ اس کی تائید کسی اثر یا سنت سے نہیں ہوتی۔ [۱۴۷]

بہت سے مسائل میں وہ ابو حنیفہ سے اختلاف کرتے ہیں اور حدیث کی بنیاد پر اہل مدینہ کی تائید کرتے ہیں۔ یہاں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی شخص ایسی صورت میں بیٹھ کر نماز پڑھا سکتا ہے کہ مقتدی پیچھے کھڑے ہوں۔ امام محمدؒ اہل مدینہ کی رائے پر عمل کرتے ہیں یعنی امام کو کھڑے ہو کر نماز پڑھانی چاہیئے لیکن ابو حنیفہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ نبی اکرمؐ کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے امام محمدؒ کہتے ہیں "ہم تک اس قسم کی کوئی حدیث نہیں پہنچی کہ ائمۃ الہدیٰ (خلفاء راشدین) حضرات ابو بکر، عمر، عثمان و علی رضوان اللہ علیہم نے یا کسی دوسرے نے بیٹھ کر نماز پڑھائی ہو لہذا ہم ان کے عمل کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ یہ زیادہ مستند ہے۔[۱۴۸] اس معاملہ میں اگرچہ وہ سنت کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن اپنے استدلال کی بنیاد وہ حدیث اور ابتدائی دور کے مسلمانوں کے عمل پر رکھتے ہیں لہذا یہ عمل جس کی تائید حدیث سے ہوتی ہے ان کی رائے میں سنت کا درجہ رکھتا ہے۔

اس مسئلہ میں جسے وہ طلاق السنۃ کہتے ہیں، طلاق کی صحیح صورت واضح کرنے کے لئے وہ رسول اللہؐ کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق طلاق کا وہ طریقہ جو آپؐ نے ابن عمرؓ کو سکھایا طلاق السنۃ کہلاتا ہے۔[۱۴۹] اس سے اور ایسی ہی دوسری مثالوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس دور میں سنت اور حدیث کی اصطلاحیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ چکی تھیں کہ اب اس کے درمیان بہت معمولی فرق باقی رہ گیا تھا۔ امام شافعی نے اس معمولی فرق کو بھی مٹا دیا۔

صدر اسلام میں سنت کے بارے میں فقہاء کے نظریات کے مذکورہ بالا تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنت میں فقہاء کی رائے اور ہر علاقہ کے مقامی رنگ کا عنصر موجود تھا۔ چونکہ ہر علاقہ کے حالات جدا تھے لہذا سنت میں اختلاف بھی فطری تھا۔ اختلافات کی شدت کا اندازہ حسب ذیل مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ امام مالک کی رائے ہے کہ میت کو لے جاتے وقت جنازہ کے پیچھے چلنا خلاف سنت (من خطاء السنۃ) ہے[۱۵۰] لیکن امام محمدؒ جنازہ کے پیچھے چلنے کو بہتر (افضل) کہتے ہیں۔[۱۵۱] سنت میں یہ اختلافات انھیں معمولی باتوں تک محدود نہ تھے بلکہ ان کی وسعت تو ربا (سود) جیسے مسائل تک تھی جسے قرآن مجید

نے واضح طور پر منع کر دیا تھا۔ امام ابو یوسف، امام اوزاعی سے اس بات پر متفق ہیں کہ ربا دار الحرب میں حرام ہے۔ لیکن مکحول سے مروی ایک اثر کی بنا پر ابو حنیفہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ شام میں رہنے کے باوجود امام اوزاعی مکحولؒ والی حدیث سے واقف نہیں ہیں (یا وہ اسے کم از کم صحیح نہیں سمجھتے) اس کے برعکس وہ اس بات کے لئے بہت سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے مابین معاملات میں ربا حرام تھا۔[۷۹] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکحولؒ والی روایت عام طور سے شام میں مشہور نہیں تھی لیکن یہ شاذ حدیث عراق میں بہت مشہور ہوئی اور یہی رائے ابراہیم نخعی، سفیان ثوریؒ[۸۰] اور امام محمدؒ[۸۱] کی بھی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ایسے نازک معاملات میں بھی سنت کس طرح علاقائی اجماع سے متاثر ہو رہی تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ہم اس مشہور قول کے معنی سمجھ سکتے ہیں کہ السنة قاضية على الكتاب یعنی سنت کتاب اللہ کی تشریح و وضاحت کرنے میں فیصلہ کن ہے۔

صدر اسلام کے فقہاء نے تعامل امت کو جو بہت زیادہ اہمیت دی اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ حدیث بعد کی پیداوار ہے۔ ابتدائی دور کے فقہاء تعامل پر کیوں زور دیتے ہیں، اس کا تجزیہ اوپر کی سطور میں ہم کر چکے ہیں۔ حدیث نبی اکرمؐ کے وقت سے موجود تھی۔ جمع حدیث کے بارے میں متاخر دور کی روایات سے قطع نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یا ان کے بعد حدیث کے وجود پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آپؐ کی صحبت میں جو لوگ رہے ہوں گے انہوں نے یقیناً آپؐ کے اعمال، اقوال اور طور طریق کے بارے میں گفتگو کی ہو گی بالخصوص جب کہ آپؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے فرض کر دی تھی۔ آپؐ کی وفات کے بعد اس قسم کی گفتگو نے یقیناً پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہو گی کیوں کہ اب ان لوگوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب جو اپنے بے نظیر حافظہ کے لئے مشہور ہیں وہ نبی کریمؐ کے اعمال و اقوال کو بیان کرنا اور دوسروں تک پہنچانا بھول جاتے حالانکہ آپؐ کے اخلاق و اعمال کو قرآن مجید نے مثالی بتایا تھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن کے الفاظ میں "اس فطری بات کا انکار بے عقلی اور تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہے"۔[۸۲]

حواشی و حوالہ جات

۱۴۱۔ ابو یوسف، الرد علی سیر الاوزاعی ص ۲۰۔ ۴۲۔ ایضاً ص ۲۱۔

۴۳- ایضاً - صہ ۱۲۱ - ۱۲۵ - مستثنیات کی مزید مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو صہ ۲۴ اور صہ ۱۰۸ - ۱۰۹ - مزید ملاحظہ ہو صہ ۱۲۶ - ۱۳۰ -

۴۴- امام شافعی، کتاب الأم، قاہرہ، ۱۳۲۵ھ جلد ہفتم صہ ۲۹ -

۴۵- ملاحظہ ہو کتاب الأم جلد ہفتم میں رسالہ بعنوان 'اختلاف مالک والشافعی' الموطا میں خیار المجلس کا مسئلہ بھی اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۴۶- ملاحظہ ہو کتاب الحج میں اہلِ مدینہ پر امام محمد کی تنقید۔

۴۷- این، جے، کولسن۔ کتاب محولہ بالا۔ صفحات ۵۰، ۵۷، ۹۸، ۹۹ -

۴۸- شخت۔ (مبادی فقہ اسلامی)۔ ص ۷۶ - (THE ORIGINS OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE) (۴۹) امام مالک، مؤطا، جلد دوم، صفحات ۸۴۸، ۸۵۱ -

۵۰- ایضاً جلد اوّل صفحات ۱۶۱، ۱۷۷، ۲۲-۲۲۲، ۲۲۶-۲۲۵ جلد دوم صفحات ۷۰۸-۷۰۹، ۷۸۸، ۸۵۴ (جا بجا)۔ (۵۱)۔ ایضاً، جلد اوّل، صفحات ۱۸، ۲۰۶ (جا بجا)۔

۵۲- ایضاً، جلد اوّل، صفحات ۲۶۸، ۲۷۶ (جا بجا)۔

۵۳- ایضاً، جلد اوّل، صفحات ۱۸، ۴۰، ۱۰۰ - جلد دوم صفحات ۹۲۱، ۹۲۶ -

۵۴- امام شافعی، کتاب الام، جلد دوم صہ ۲۴۰ - وزعمت ان تثبیت السنة من وجهين: احدهما ان تجد الائمة من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالوا بما يوافقها والاخر ان لا تجد الناس اختلفوا فيها۔

۵۵- ایضاً صہ ۲۴۲ - ۵۶- مالک، مؤطا، جلد اوّل صہ ۲۱۴ -

۵۷- ایضاً، جلد اوّل صہ ۱۷۷ - جلد دوم صفحات ۵۱۴، ۸۵۴ -

۵۸- ایضاً، جلد دوم صہ ۸۵۹ - ملاحظہ ہوں وہ مقامات بھی جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو امام مالک نے استدلال کی اصل بنیاد بنایا ہے۔ ایضاً، جلد اوّل ص ۲۴۱ ۲۴۱ - ۲۴۲ ؛ جلد دوم صفحات ۴۵۶، ۴۷۵، ۴۷۶، ۶۵۰، ۶۷۷ وغیرہ۔

۵۹- سحنون۔ المدونۃ الکبریٰ۔ قاہرہ ۱۳۲۳ھ، جلد چہارم صہ ۲۶ - یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابن قاسم صرف عمل ہی پر اعتماد نہیں کرتے۔ (ایضاً صہ ۶۳۔ ذیلی نوٹ) بلکہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روایت پر اعتماد کرتے ہیں جس کی توثیق عمل سے بھی ہوتی ہے۔

۶۰ ۔ ایضاً، جلد اوّل، صہ۵۔ ۶۱ ۔ شخت ۔ مبادی فقہ اسلامی (انگریزی) صہ ۲۴۔

۶۲ ۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، محولہ بالا ایڈیشن صہ ۱۱۸ و مابعد۔

۶۳ ۔ ابو یوسف، الرد علی سیر الاوزاعی، ص ۳۴ ۔ ۳۷۔

۶۴ ۔ ایضاً صہ ۴۱۔ ۶۵ ۔ ایضاً صہ ۳۲۔ ۶۶ ۔ ایضاً صہ ۳۱۔

۶۷ ۔ ایضاً صہ ۲۵ ۔ ۲۴ ۔ مزید ملاحظہ ہو، امام شافعی، کتاب الام، جلد ہفتم صہ ۳۱۰ ۔ ۳۰۹۔

۶۸ ۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، محولہ بالا ایڈیشن صہ۹۹۔

۶۹ ۔ ابو یوسف، الرد علی سیر الاوزاعی صہ ۵۵ ۔ ۷۷۔

۷۰ ۔ ایضاً صہ ۷۶۔ ۷۱ ۔ ایضاً صہ ۴۱ ۔ ۴۲۔

۷۲ ۔ امام محمد بن الحسن ۔ الموطا ۔ صہ ۱۷۶ ۔ السنة أن توخذ الجزية من المجوس من غير أن تنكح نساؤهم ولا تؤكل ذبائحهم، وكذلك بلغنا عن النبي صلى الله عليه وسلم۔

۷۳ ۔ امام محمد بن الحسن، کتاب الحج (قلمی) صہ ۸۸، ۱۸۸ (جا بجا)۔ ۷۴ ۔ ایضاً صہ ۶۰۔

۷۵ ۔ ایضاً صہ ۳۲ ۔ ذمی کے خون بہا کے مسئلہ میں اہلِ مدینہ سے امام محمدؒ کا اختلاف ان کی اتباعِ حدیث کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ وہ اہلِ مدینہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے اعمال کو ترک کرنے اور حضرت معاویہؓ کے عمل کو ترجیح دینے کا الزام لگاتے ہیں ۔ مزید ملاحظہ ہو: امام شافعی کتاب الام جلد ۷ صہ ۲۶۴۔ ۷۶ ۔ امام محمد ۔ الموطا صہ ۲۶۴۔

۷۷ ۔ امام مالک موطا جلد اوّل صہ ۲۲۵ ۔ ۲۲۶۔ ۷۸ ۔ امام محمد ۔ الموطا صہ ۱۶۶۔

۷۹ ۔ ابو یوسف الرد علی سیر الاوزاعی ۔ صہ ۹۶ ۔ ۹۸۔

۸۰ ۔ امام طحاوی، مشکل الآثار، حیدر آباد دکن ۱۳۳۳ھ، جلد چہارم صہ ۲۴۵۔

۸۱ ۔ امام محمد، السیر الکبیر، حیدر آباد دکن، تاریخ درج نہیں، جلد سوم، صہ ۲ ۔ ۸۔

۸۲ ۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، اسلامی منہاجیات تاریخ کے آئینہ میں (ISLAMIC METHODOLOGY IN HISTORY) ۔ لاہور، ۱۹۶۵ء صہ ۳۲۔